اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزشتہ دنوں وفاقی وزیر قانون جناب سیّد اقبال حیدر کے حوالے سے جو "مباحثہ" جاری رہا، اس نے ایک بار پھر یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ علماء اسلام اور عامۃ المسلمین ہمیشہ کی طرح آج بھی متفق الرائے ہیں کہ شاتم رسول ﷺ کی سزا، سزائے موت ہے اور اس جرم سے متعلق تعزیرات پاکستان کی دفعات ۲۹۵ - ب اور ۲۹۵ - ج اسلامی روایت کے مطابق ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکولر پس منظر میں، یہ بات چنداں تعجب خیز نہیں کہ اس کی صفوں میں ایسے عناصر موجود ہیں، جو "مملکت خداداد پاکستان" کو محض ایک جدید طرز کی قومی - سیکولر ریاست دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کی دینی نظریاتی اساس کو اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ اس سوچ کا اظہار بعض اوقات ذمہ دار پارٹی قیادت کے قول و عمل سے بھی ہو جاتا ہے، تاہم پارٹی قیادت کو جب (اگرچہ بعد از خرابیٔ بسیار) عوامی جذبات کا احساس ہوتا ہے تو اس کی رائے عامۃ المسلمین کی رائے سے اکثر مختلف نہیں رہتی۔

آج جب "قانون گستاخی رسالت" پر حکمرانوں اور عامۃ المسلمین کے درمیان بظاہر کوئی اختلاف نہیں، کچھ "دانش ور" قسم کے لوگ بدستور غلط مبحث کیے جا رہے ہیں۔ دفعات ۲۹۵ - ب اور ۲۹۵ - ج اُنہیں متنازعہ نظر آتی ہیں۔ کیا یہ دفعات دستوری طریق کار کے مطابق رو بہ عمل نہیں آئیں؟ کیا ملک کے قانون ساز اداروں کو ان سے اختلاف ہے؟ اگر یہ دفعات دستوری طریق کار کے مطابق تعزیرات پاکستان کا حصّہ بنی ہیں تو کسی "دانش ور" کے اختلاف رائے سے یہ متنازعہ نہیں بن جاتیں۔ کاش ہمارے یہ "دانش ور" عوام کے حقوق کی اہمیت بتانے کے ساتھ ساتھ عوام کی رائے کا احترام بھی کر لیں۔

"قانون گستاخی رسالت" کے ساتھ ساتھ ان "دانش وروں" کو عامۃ المسلمین کے وہ رہنما پسند نہیں جنہوں نے پہلے لندن کے سلمان رشدی اور اب ڈھاکہ کی تسلیمہ نسرین کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ یہ رہنما ان دانشوروں کی ذاتی "تاریخ فہمی" کے لحاظ سے اسلامی روایات کے خلاف کام کر رہے ہیں، مگر حیرت ہے کہ جہاں عامۃ المسلمین کے رہنما حُب رسولؐ کے حوالے سے اپنی تاریخ اور تہذیبی روایات کا تذکرہ کرتے ہیں اور مثالوں پر مثالیں دیے چلے جاتے ہیں، وہیں بے لگام آزادیٔ رائے کے حق میں لکھنے والے ان "دانش وروں" کی تحریروں میں چند چلتے ہوئے جملوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

"قانون گستاخی رسالت" کے ساتھ ساتھ وطنِ عزیز میں رائج شدہ اُن قوانین اور اقدامات پر بھی سیاہی پھیرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو شریعتِ اسلامیہ پر مبنی ہیں۔ ان قوانین کو نفاذِ شریعت کی عوامی خواہش کے بجائے ایک "آمر مطلق" کے دورِ اقتدار کے ساتھ منسلک کر کے اِن کی تخفیف کی جاتی ہے۔ "آمر مطلق" نے یہ اقدامات کیوں کیے تھے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مرحوم ضیاء الحق بھی کسی دوسرے حکمران کی طرح اپنے دورِ اقتدار کو طول دینے کی خواہش رکھتے تھے اور "طوالتِ اقتدار" کے لیے منجملہ دوسرے عناصر کے، عوامی جذبات کی تسکین ایک لازمی عنصر ہے۔ نفاذِ شریعت اسلامیہ پاکستان کے عامتہ المسلمین کی وہ دیرینہ خواہش ہے جس سے مرحوم ضیاء الحق بخوبی واقف تھے اور اس سے اُنہوں نے پورا پورا استفادہ کیا۔ کسی مضبوط عوامی - سیاسی بنیاد کی عدم موجودگی میں نیم دلی کے ساتھ کیے گئے ادھورے اقدامات سے مطلوبہ عمرانی و اقتصادی نتائج تو برآمد نہ ہو سکے، البتہ مرحوم ضیاء الحق کی اسلام دوستی کو اِن سے ضرور سہارا ملا اور اُن کے خلاف عامتہ المسلمین اُس طرح سڑکوں پر نہ آئے جس طرح ۱۹۷۷ء میں آ گئے تھے۔

مرحوم ضیاء الحق کے دورِ اقتدار کے اقدامات کو صحیح تر تناظر میں دیکھنے سے یہ بات واضح ہے کہ نفاذِ شریعت کے سلسلے میں اُن کے اقدامات محض اُن کی ذاتی خواہش کی تکمیل نہ تھے، بلکہ ان کے پیچھے عوامی جذبات و خواہشات بھی موجود تھیں۔ لہذا شریعت اسلامیہ سے عامتہ المسلمین کی محبت کی تخفیف نہ کی جائے تو وطنِ عزیز کی سیاسی و دینی فضا کے لیے مفید ہو گا۔

اگر یہ "دانش ور" اپنی سوچ کو عامتہ المسلمین کی سوچ سے ہم آہنگ نہیں کر سکتے تو کم از کم اُنہیں یہ بات مان لینا چاہیے کہ ہر ملک کے رہنے والوں کی طرح پاکستان کے عامتہ المسلمین کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی تاریخ، تہذیب اور قانونی روایات کے مطابق اپنے معاشرے کی تشکیل کریں۔ چاہے عامتہ المسلمین کے تصوراتی معاشرے میں اِن سیکولر "دانش وروں" کو سرے سے کوئی مقام ہی حاصل نہ ہو۔